بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

جس طرح محض استغاثہ کے گواہوں کی شہادت پر فیصلہ اصولِ انصاف کے منافی ہے بالکل اسی طرح کسی فرد یا گروہ کی کارگزاریوں کا یک طرفہ پروپیگنڈہ صحیح صورتِ حال کے افشا میں مانع ہوتا ہے۔ کسی صحیح نتیجہ پر پہنچنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ تصویر کے دونوں رُخ دیکھ کر فیصلہ کیا جائے۔

یوں تو ۱۹۵۸ء میں مارشل لا کے آغاز ہی سے یک طرفہ پروپیگنڈے کی مہم پورے زور و شور سے شروع ہو گئی اور نشر و اشاعت کے سارے ذرائع لوگوں کے دل و دماغ پر صرف یہ نقش بٹھانے میں پوری مستعدی کے ساتھ استعمال ہونے لگے کہ عالی مرتبت جناب فیلڈ مارشل صاحب کی قیادت قوم کے سارے دکھوں کا مداوا ہے۔ یہ اُن کا قوم پر بہت بڑا احسان ہے کہ انہوں نے نہایت نازک وقت میں غیر معمولی ایثار سے کام لے کر ملک کی عنانِ اختیار سنبھال لی۔ اگر وہ قوم کے لیے یہ قربانی نہ کرتے تو ملک برباد ہو چکا ہوتا۔ انہوں نے جو فلسفۂ زندگی ہمیں دیا ہے وہی ہماری قومی فلاح کا ضامن ہے اور انہوں نے اپنے دورِ اقتدار میں ملک کو جس نہج پر چلانے کی کوشش کی ہے وہ نہج ہی سب سے زیادہ صحیح اور ہمارے قومی مزاج کے مطابق ہے۔ برسرِ اقتدار طبقے خصوصاً اس کی سب سے نمایاں شخصیت کے بارے میں اس نوعیت کے خوش کُن تاثرات کی فضا میں جب کہ اُن کی تعریف و توصیف میں مفاد پرستوں نے زمین و آسمان کے قلابے ملا رکھے ہوں اور انہیں مسلسل یہ باور کرانے کی کوشش کی جا رہی ہو کہ انہوں نے امورِ مملکت کو جس انداز سے چلایا ہے وہ تو خلافتِ راشدہ کے انداز سے بھی بہتر ہے، کوئی تلخ بات کہنا محض جشنِ ترقی کے مزے کو کرکرا کرنا ہے۔ لیکن ہم ایمانداری کے ساتھ قوم اور وطن اور خود صاحبِ صدر کی بھلائی اسی میں سمجھتے ہیں کہ وہ خوشامدیوں کی ان خوشامدانہ باتوں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اُس صورتِ حال کا

جائزہ لیں جو حکومت کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے پیدا ہو گئی ہے اور جس نے برسرِ اقتدار طبقے کو پروپیگنڈا مشنری کے پورے استعمال کے باوجود عوام کی نظروں میں بے وقعت بنا دیا ہے۔

ہم اس ضمن میں صدرِ مملکت کی خدمت میں یہ عرض کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ جو لوگ آج اُن کی شان میں ہر وقت قصیدے پڑھتے رہتے ہیں اور انہیں کوئی صحیح مشورہ دینے کے بجائے انہیں خوش کُن باتیں سناتے رہتے ہیں اُن سے زیادہ اس ملک میں کوئی خطرناک گروہ نہیں۔ یہ مفاد پرستوں کا ایک ٹولہ ہے جس کا کام ہر صاحبِ اقتدار سے مادی فائدے اور ناجائز منفعتیں حاصل کرنا ہے۔ انگریز کے عہد میں یہ لوگ انگریز بہادر کے پرستار تھے اور اس کی حکومت کی فلاح و بقا کے لیے دعائیں مانگا کرتے تھے اور جب آزادی کی کوئی تحریک شروع ہوتی تو اسے "سماج دشمن عناصر کی تخریبی سرگرمیوں" سے موسوم کر کے اُسے انہیں کچلنے کی ترغیب دیا کرتے تھے۔ جب ان لوگوں نے یہ دیکھا کہ اب انگریز یہاں سے رخصت ہونے لگا ہے اور قومی حکومتیں قائم ہونے والی ہیں تو ان لوگوں نے پھر اپنی وفاداریاں بدلیں اس کے بعد جتنی حکومتیں بدلتی گئیں یہ لوگ ہوا کے رُخ کے ساتھ ساتھ مُرغِ بادنما کی طرح اپنے موقف کو مسلسل تبدیل کرتے رہے۔ انہوں نے ہر چڑھتے سورج کی پرستش کی اس بنا پر ان لوگوں کی بیان بازیاں اور ان کی بشارتیں قطعاً کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ یہ تو ہر صاحبِ اختیار کی خوشامد کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ انہیں قوم، ملک اور کسی فرد یا گروہ سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں۔ انہیں اگر دنیا کی کسی چیز سے وابستگی ہے تو وہ اپنے مفادات ہیں اور چونکہ حکومت کے ذریعہ یہ مفادات بہتر طور پر حاصل ہو سکتے ہیں اس لیے ان کے نزدیک ہر وہ شخص عیب سے پاک، عظیم مُصلح اور بے مثال مدبّر ہے جو اقتدار کے تخت پر متمکن ہے اور ہر وہ فرد یا گروہ تخریب پسند ہے جو اقتدار کی ہاں میں ہاں نہیں ملاتا اور اس کے بعض فیصلوں اور اس کی بعض پالیسیوں سے اختلاف کی جرأت کرتا ہے۔ مفاد پرستوں کے اس طبقے نے ملک و ملت اور خود اصحابِ اقتدار کو جس قدر نقصان پہنچایا ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ اور اس کی تلافی کی صورت بجز اس کے کوئی نظر نہیں آتی کہ مالک الملک اس ملت پر رحم فرما کر اس نقصان کو پورا کرے۔ اس طبقے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ ضمیر فروشوں کی ایک ایسی فوج تیار ہو گئی ہے جو عنانِ اختیار سنبھالنے والے ہر شخص کا ہر حال میں خیر مقدم کرتی ہے اور پھر اس

کے ہر قول اور فعل پر تعریف و توصیف کے ڈونگرے برساتی ہے اور جونہی وہ اقتدار سے محروم ہوتا ہے تو اس سے یک لخت آنکھیں پھیر کر انہیں مسندِ اقتدار پر براجمان ہونے والے کی راہ میں بچھا دیتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہاں جو شخص بھی مسندِ اقتدار سنبھالتا ہے وہ اپنے ارد گرد حاشیہ برداروں کی ایک ایسی فوج پاتا ہے جو کوئی صحیح مشورہ اور صائب رائے اُس تک پہنچنے ہی نہیں دیتی اور اگر کسی طرح پہنچ بھی جائے تو اُس پر اُسے غور کرنے اور سوچنے کا موقع فراہم نہیں ہونے دیتی اور اسے مسلسل یہ باور کرانے کی کوشش کرتی ہے کہ یہ تخریب پسندوں کی کارروائی اور اس کے بدخواہوں کی چال ہے۔ کاسہ لیسوں کی اسی فوج نے مختلف اوقات میں حکمرانوں کو نہایت غلط مشورے دیکر جس طرح ملک کو برباد کیا ہے وہ بڑی عبرتناک داستان ہے۔ جسے یہاں اس وقت دُہرانا مقصود نہیں بلکہ صرف اس حقیقت کی وضاحت کرنا ہے کہ عوام آج جس طرح کرب و اضطراب محسوس کر رہے ہیں اس کے اسباب کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ خوشامدیوں کی بیان بازیاں عوام کے دکھ درد کو دُور کر کے برسرِ اقتدار طبقے کے بارے میں اُس کے اندر اطمینان پیدا نہیں کر سکتیں۔

ہمارے نزدیک اضطراب کی اصل وجہ یہ ہے کہ اس ملک میں ابھی تک کوئی ایسا سیاسی نظام تشکیل نہیں پا سکا جو رائے عامہ کو ملک میں غالب بننے کا بآسانی موقع فراہم کر سکے۔ یہ اس قوم کی بہت بڑی بدنصیبی ہے کہ یہاں کوئی ایسا لگا بندھا ضابطہ طے نہیں ہو سکا اور کوئی ایسی روایت قائم نہیں کی جا سکی جس کی مدد سے مسندِ اقتدار بالکل فطری طریقے سے اُن لوگوں کی طرف منتقل ہوتی رہے جن کے بارے میں رائے عامہ کی عدالت فیصلہ کر دے یا دوسرے لفظوں میں ہم اپنے لیے کوئی ایسی متعین راہ تجویز نہیں کر سکے جس کے مطابق عوام اپنی منشا اور مرضی سے اپنے حکمرانوں کا انتخاب کر سکیں۔ ہمارے ہاں استعماریت کا وہی انداز چلا آ رہا ہے کہ قوت کے بل بوتے پر ایک مختصر سی من چلی اقلیت پہلے عوام کی گردنوں پر مسلط ہو اور وہ پھر انتظامی مشینری کے استبداد اور مفاد پرستوں کی تائید سے حکومت کرے۔ انگریز ایک صدی سے زیادہ مدت تک اسی اصول کے مطابق یہاں حکومت کرتا رہا لیکن عوام کی سیاسی بیداری بلکہ اُن کی انسانیت کے جاگنے پر جب اسے یہاں سے رخصت ہونا پڑا تو اس نے اپنی جانشینی کے لیے ایک ایسا طبقہ چھوڑا جو یہی استعماری رجحانات رکھتا تھا۔

ہماری ملی زندگی کے لیے سب سے زیادہ منحوس وہ دن تھا جس روز غلام محمد صاحب نے ساری دستوری روایات نظر انداز کرتے ہوئے محض فوج اور انتظامی مشینری کے بل بوتے پر اسمبلی کو توڑا اور وزیر اعظم کو برطرف کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملت کے وہ "خیر خواہ" جو رائے عامہ کی تائید حاصل کر کے برسرِ اقتدار آنے کے صبر آزما راستے سے گزرنا نہیں چاہتے تھے بلکہ محض قوت کے زور سے یہ مسند سنبھالنے کے آرزو مند تھے انہیں اس بات کی شہ ملی کہ وہ اس آسان اور سستے نسخے کو آزمائیں۔ رائے عامہ کی تربیت کی طرف توجہ دینے کے بجائے اب ہر اس شخص یا گروہ نے جسے ملک کے اجتماعی معاملات سے کوئی دلچسپی بھی تھی، اسی آسان اور سہل طریق پر عمل کرنا شروع کیا۔ جو لوگ مسندِ اقتدار سنبھالے ہوئے تھے انھوں نے عوام کے منشا کے علی الرغم اس کے ساتھ مختلف حیلوں بہانوں سے چمٹے رہنے کی کوشش کی اور جو لوگ اقتدار کی دوسری اور تیسری صفوں میں تھے انہوں نے جمہوریت کی سیدھی راہ اختیار کرنے کے بجائے غیر آئینی ذریعے سے اقتدار پر قبضہ کرنے کے لیے جدوجہد شروع کی۔ چنانچہ اسی جدوجہد کے نتیجے میں یہاں فوجی انقلاب آیا۔

جو لوگ اجتماعی مسائل کی کوئی سمجھ بوجھ رکھتے ہیں وہ اُس وقت بھی اس تبدیلی سے کبیدہ خاطر ہوئے کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اس قسم کے انقلابات کبھی مفید نہیں ہوتے اور اس سے محلاتی سازشوں کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ پھر دوسرے مسلمان ممالک میں اس نوعیت کے انقلابات نے امتِ مُسلمہ کو جو شدید نقصانات پہنچائے ہیں اُن کے نتائج سامنے ہونے کی وجہ سے وہ اس نوعیت کی تبدیلی سے سخت خوفزدہ تھے اور اس بات کے لیے اللہ کے حضور میں دعا گو تھے کہ یہ انقلاب کہیں پاکستان کو بھی اُس خطرناک راہ پر نہ ڈال دے جس پر کہ اس وقت دوسرے ملکوں کے مسلمان چل رہے ہیں۔ فیلڈ مارشل صاحب نے عنانِ اقتدار سنبھالنے کے ساتھ لوگوں کو جو امیدیں دلائیں اور خصوصاً اُن سے انہیں اپنے جمہوری حقوق واپس دلانے کے جو عہد کیے اُس سے اُن کے اندر کچھ حوصلے پیدا ہوئے اور وہ یہ سمجھ کر خاموش ہو گئے کہ شاید یہ بے پناہ قوت کی مالک شخصیت کوئی ایسی راہ متعین کر دے جس سے آئندہ رائے عامہ ایک ضابطے کے تحت بآسانی غالب ہونے میں کامیاب ہو سکے۔ مگر افسوس کہ عوام کی یہ توقعات کسی طرح بھی پوری نہ ہوئیں بلکہ اُن کے سامنے جو نئی صورتِ حال آئی وہ پہلی صورتِ حال سے بھی کہیں زیادہ تکلیف دہ تھی۔

پہلے رائے عامہ کی مدد سے اقتدار کو تبدیل کرنے کی ایک راہ بہر حال موجود تھی جس میں بعض رکاوٹوں کی وجہ سے رائے عامہ کا قافلہ وقتی طور پر رک گیا تھا، لیکن بنیادی جمہوریت کے نظام نے اس راہ کو ہی بالکل توڑ پھوڑ کر رکھ دیا اور اس کی جگہ ایک ایسا راستہ نکالا جو عوام کی رائے کو مسندِ اقتدار پر نہیں پہنچاتا بلکہ اقتدار کی خواہشات، اُس کے عزائم اور اس کے استبداد کو عوام پر مسلط کرتا ہے

سرکارِ عالی مدار کی طرف سے اس نظام کے بارے میں یہ کہا جاتا ہے کہ یہ ایک جمہوری نظام ہے کیونکہ ابتدائی منزل پر عوام ہی اپنے نمائندے چُنتے ہیں لیکن یہ محض فریب نظر ہے کسی مرحلہ پر صرف ووٹ دے دینے سے کوئی نظام جمہوری نہیں بن سکتا۔ جمہوری نظام کا صرف ایک ہی معیار ہے کہ اس نظام کے ذریعہ رائے عامہ کس حد تک غالب قوت بنتی ہے اور پھر وہ عوامی خواہشات اور تمناؤں کی کس طرح ترجمانی کرتی ہے۔ جو نظام عوام کے عزائم اور ان کی تمناؤں کا مظہر نہیں وہ کسی لحاظ سے بھی جمہوری نہیں کہلا سکتا۔ یہ نظام جو اس وقت ہم پر مسلط ہے اپنے اندر بالکل صریح طور پر آمرانہ رجحانات رکھتا ہے اور یہ جمہوریت سے کہیں زیادہ آمریت کے قریب ہے مغرب اور مشرق کے جن ممالک میں مسندِ اقتدار مدت تک ایک سے دوسرے کی طرف منتقل نہیں ہوتی مگر نظام آمرانہ ہی ہوتا ہے وہاں بھی انتخاب کا ڈھونگ ضرور رچایا جاتا ہے اور ہر فرد کو ایک ایسا مرحلہ ضرور درپیش ہوتا ہے جس میں وہ ووٹ دیتا ہے مگر اس کے باوجود وہاں ڈکٹیٹرشپ قائم ہوتی ہے اور حکمران طبقہ عوامی خواہشات کا احترام کرنے کے بجائے اُن پر اپنی مرضی ٹھونستا ہے آخر کیا وجہ ہے کہ ایک ملک میں ووٹ ڈالنے سے رائے عامہ مقتدر بنتی ہے۔ لیکن دوسرے ملک میں اس ووٹ سے آمریت قائم ہوتی ہے یہ کوئی ایسا پیچیدہ سوال نہیں جسے سمجھنے کے لیے کسی گہرے غور و فکر کی ضرورت ہو۔ اصل وجہ یہ ہے کہ آمرانہ نظام میں ووٹ کی مدد سے عوام کی اجتماعی قوت کو چند منتشر مقامات پر مجتمع کر کے اس پر قبضہ کر لیا جاتا ہے۔ اس طرح پوری قوت سمٹ کر ایک ہاتھ یا چند ہاتھوں میں چلی جاتی ہے اور پھر اسے حکمران طبقے جس طرح چاہتے ہیں استعمال کرتے ہیں، اور اس امر کے لیے کوشاں رہتے ہیں کہ جن جن مختلف مقامات پر اجتماعی قوت جمع ہے وہ براہِ راست اُن کی تحویل میں رہیں اور عوام ان پر اثر انداز ہونے کے بجائے وہ عوام پر اثر انداز ہوں۔ ان مقامات کی حیثیت عوامی نمائندگی کے

مراکز کی نہیں بلکہ حکومت کے ڈپوؤں کی سی ہو جاتی ہے جہاں برسرِ اقتدار طبقے کے رجحانات عوام میں تقسیم ہوتے ہیں یہ مراکز درحقیقت نوکر شاہی کا پارٹ ادا کرتے ہیں۔

جن جن ممالک میں آج آمریت پائی جاتی ہے وہاں باقاعدہ ووٹ ڈالے جاتے ہیں۔ لیکن یہ ووٹ اس بات کی علامت نہیں کہ ووٹ دینے والے ملک کے اجتماعی معاملات میں شریک ہیں اور اس بات کا حق رکھتے ہیں کہ امورِ مملکت کو اُن کے منشا کے مطابق چلایا جائے بلکہ یہ ووٹ اس بات کا اظہار ہے کہ عوام نے ووٹ دیکر اپنے جمہوری حقوق کو تیاگ دیا ہے اور حکومت من مانی کارروائیاں کرنے میں اب یکسر آزاد ہے۔ ووٹ کی ایک قسم وہ ہے جس کے ذریعے ایک فرد کا اجتماعی معاملات میں استحقاق ثابت ہوتا اور اس بات کا اعتراف ہوتا ہے کہ وہ اس کائنات کی کوئی بیکار چیز نہیں کہ اُسے نظر انداز کر دیا جائے۔ ووٹ کی دوسری قسم وہ ہے جس کا مقصد بجز اس کے اور کوئی نہیں کہ ایک شخص ووٹ کے ذریعہ اپنی ذات، اپنی افادیت اور اپنے فہم و تدبر کی نفی کر دے اور اپنے سارے انسانی حقوق سے خود دستبردار ہو کر ووٹ حاصل کرنے والے کو پورے سیاہ سپید کا مالک بنا دے۔ ووٹ کی پہلی قسم سے رائے عامہ ایک غالب قوت بن کر اجتماعی معاملات کو چلانے کا ذریعہ بنتی ہے اور دوسری قسم سے اسے بے وزن اور غیر مؤثر بنانے کا کام لیا جاتا ہے۔

دنیا کے اشتراکی اور نیم اشتراکی ممالک اور بعض دوسری آمرانہ ریاستوں میں ووٹ اور انتخاب کے کھیل پوری طرح کھیلے جاتے ہیں مگر کہیں بھی یہ ووٹ قوتِ حاکمہ کی صورت میں نہیں ڈھل سکتے بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ قوتِ حاکمہ ایک کامیاب ہدایت کار کی طرح انتخاب کے پورے ڈرامے کی ہدایت کاری کرتی ہے اور جس جس مرحلے پر جو کام کسی فرد سے لینا چاہتی ہے بڑی آسانی سے لے لیتی ہے۔ ان انتخابات سے ہیئت حاکمہ میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی اور سلطنت کے کاروبار کو یہ ہیئت جس طرح چاہتی ہے رائے عامہ کی مرضی سے بے نیاز ہو کر چلاتی ہے۔ ان ممالک کا اصولِ انتخاب ایک ہی نوعیت کا ہے کہ سب سے پہلے حسبِ منشا اس قوت کو بعض جگہوں پر مجتمع کر لیا جائے اور پھر ترغیب و ترہیب کے مختلف ذرائع استعمال کر کے اسے اپنی

طرف منتقل کر لیا جائے۔

جو شخص بھی عوامی جمہوریت اور اس آمرانہ جمہوریت کے مزاج کو سمجھنا چاہتا ہو اسے اس وقت کے بی ڈی نظام پر غور کرنا چاہیے۔ ملک کی ساری عوامی قوت سمٹ سمٹا کر ایک لاکھ بیس ہزار نفوس کے ہاتھ میں چلی گئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر پہلے مسندِ اقتدار حاصل کرنے کے لیے ملک کی عظیم اکثریت کی تائید ضروری تھی تو اب چند ہزار افراد کی تائید سے یہ مقصد بآسانی حل ہو سکتا ہے۔ اس محدود حلقے پر حکومت کی قوت کے ساتھ اثر انداز ہو کر مسندِ اقتدار کو اپنے لیے محفوظ کر لینا کوئی مشکل بات نہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسندِ اقتدار پر عوامی خواہشات کے مطابق افراد اور گروہ متمکن نہیں ہوتے بلکہ وہ لوگ براجمان ہو جاتے ہیں جو عوامی تائید سے گو محروم ہوں مگر ان کے ہاتھ میں فوج اور پولیس کی طاقت ہو۔ یہ عوامی نمائندے جب یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ نہ تو حکومت کے دباؤ کا مقابلہ کر سکتے ہیں اور نہ اُن کی رائے ملکی معاملات میں مؤثر ثابت ہوتی ہے تو وہ قوت کے سامنے جھک کر اپنے آپ کو حکومت کے ایجنٹ اور آلۂ کار بنا لیتے ہیں کیونکہ انہیں اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ حکومت کے ساتھ تعاون کرنے سے انہیں بہت سے دنیاوی فوائد حاصل ہو سکتے ہیں اور خود ان کی اپنی چودھراہٹیں قائم رہ سکتی ہیں۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ یہ نمائندے عوام کے احساسات کی ترجمانی کرنے کے بجائے حکومت کے مفادات کی پاسبانی کرنے لگتے ہیں اور برسرِ اقتدار طبقہ انہیں جس طرح چاہتا ہے استعمال کرتا ہے اور اگر ان میں سے کوئی اس پر آمادہ نہ ہو تو اسے عضوِ معطل بنا کر رکھ دیا جاتا ہے۔

بنیادی جمہوریت کے یہ ارکان حکومت کے ہاتھ میں جس طرح بے بس اور رائے عامہ سے بے تعلق اور بے نیاز ہیں اُس کے اندازے کے لیے کسی گہری تحقیق کی ضرورت نہیں۔ صورتِ حال سب کے سامنے ہے۔ ذرا غور فرمائیں کہ آخر کتنے ہی مسائل ایسے ہیں جن میں عوام کی رائے حکومت کی رائے سے مختلف ہے اور جنہیں عوام تشویش کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور وقتاً فوقتاً اپنی ناراضگی کا اظہار بھی کرتے رہتے ہیں لیکن ان "عوامی نمائندوں" کو شاید ہی کبھی اس بات کی توفیق نصیب ہوئی ہو کہ وہ عوامی مطالبات کی حمایت کریں اور حکومت

کو اس بات پر مجبور کریں کہ وہ رائے عامہ کا احترام کرتے ہوئے انہیں منظور کرے۔ ان لوگوں نے بھولے سے بھی حکومت کی غلط پالیسیوں پر اُسے کبھی نہیں ٹوکا۔ ان نمائندوں کے جو ادارے مختلف سطحوں پر قائم ہیں ان کی کارگزاری کی جو داستانیں اخبارات میں آئے دن شائع ہوتی رہتی ہیں انہیں دیکھنے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ان کا کام صرف برسراقتدار طبقے کی مدح و توصیف، اُس کی مختلف پالیسیوں کی توثیق ان کی خدمت میں سپاس نامے پیش کرنا یا مبارکبادی کے پیغامات بھیجنا ہے۔ ان اداروں کے معرض وجود میں آنے سے نوکر شاہی کو تقویت حاصل ہوئی ہے اور حکومت کو بغیر کچھ زیادہ خرچ کیے ایسے کل پرزے میسر آ گئے ہیں جو اُس کے عزائم کی بلا تامل تکمیل کرتے ہیں جس طرح نوکر شاہی ہمیشہ حکمران طبقے کے مفادات کی حفاظت کرتی اور اُس کی وارفتگی اور خواہشوں کو بروئے کار لاتی ہے بالکل اسی طرح بلکہ اس سے کہیں زیادہ وارفتگی کے ساتھ بی۔ ڈی ممبروں کا طبقہ حکومت کی پالیسیوں کو عوام پر مسلط کرتا ہے۔ ایک نہیں متعدد ایسے معاملات ہیں جن سے عوام سخت نالاں ہیں۔ مثلاً گرانی، رشوت، اقربا نوازی، اخلاقی بے راہ روی، غیر ملکی قرضوں کی بھرمار، بے روزگاری، حکومت کا تشدد، نشر و اشاعت پر پابندی شہری حقوق کی پامالی، دولت کی غیر عادلانہ تقسیم، غیر اسلامی نظریات کی ترویج، ثقافت کے نام پر فحاشی کی ترویج، مگر "عوامی نمائندوں" نے ایک معاملے میں بھی حکومت پر گرفت کرنے کی جسارت نہیں کی۔ ان کے جو بیانات اخبارات میں آتے رہتے ہیں اُن سے سوائے حکومت کی حمد و ثنا کے اور کوئی چیز ظاہر نہیں ہوتی اور ان مسائل کے بارے میں یہی تاثر قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ بے چینی صرف چند شورش پسندوں کی پھیلائی ہوئی ہے ورنہ ملک میں تو شہد اور دودھ کی نہریں بہ رہی ہیں اور عوام بالکل مطمئن اور خوشحال ہیں اور وہ برسرِ اقتدار طبقوں کی خیریت کے لیے دعا گو ہیں۔

جو طبقہ عوامی مسائل اور مصائب سے اس قدر بیگانہ ہو وہ آخر عوام کی نمائندگی کا حق کس طرح ادا کر سکتا ہے۔ یہ طبقہ دراصل برسرِ اقتدار گروہ کی نمایندگی کرتا ہے اور اس میں قصور اس طبقے کا نہیں بلکہ اُس نظام کا ہے جس کے تحت اسے جنم دیا گیا ہے۔ اگر بنیادی جمہوریت کے ان مختلف اداروں کو مقامی مسائل حل کرنے کے مواقع فراہم کیے جاتے اور ان پر حکومت کا براہِ راست تسلط نہ ہوتا تو یہ بہت کچھ مفید خدمت سرانجام دے

سکتے ہیں لیکن انہیں تختِ اقتدار کے حصول کا ذریعہ بنا کر براہِ راست اپنی تحویل میں لے لیا گیا جس کا نتیجہ ظاہر ہے کہ حکومت کی گرفت اور زیادہ مضبوط ہو گئی ہے۔ عوام بیچارے اپنے اندر کوئی ایسا گروہ اور ادارہ نہیں پاتے جس کے ذریعے وہ اپنے احساسات ظاہر کر سکیں اور اپنی مرضی بروئے کار لا سکیں۔ وہ جب یہ دیکھتے ہیں کہ اُن کے ووٹوں سے چُنے ہوئے لوگ اُن کے دکھوں کا مداوا کرنے کے بجائے حکومت کے ہر صحیح اور غلط کام کی تائید پر کمربستہ ہیں تو اُن کے اندر شدید مایوسی پیدا ہوتی ہے اور اس مایوسی نے ایک تشویشناک اضطراب کی صورت اختیار کر لی ہے۔ عوام پہلے نوکر شاہی سے تنگ آئے ہوئے تھے اور وہ اس کے ساتھ اور حال کے طرزِ عمل کو دیکھتے ہوئے یہ محسوس کر رہے تھے کہ رائے عامہ کے غالب آنے میں یہ طبقہ سب سے زیادہ مزاحم ہوتا ہے۔ اب وہ اس نوکر شاہی کے ساتھ جب ان بنیادی جمہوریتوں کی کارکردگی کا جائزہ لیتے ہیں تو انہیں وحشت ہوتی ہے اور وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ ادارے حکومت کی تمناؤں کو اُن پر ٹھونسنے کے لیے قائم کیے گئے ہیں۔

حکومت اگر واقعی یہ سمجھتی ہے کہ اُسے عوام کی تائید حاصل ہے تو پھر وہ براہِ راست انتخاب کے ہمہ گیر مطالبے کو آخر کیوں تسلیم نہیں کر لیتی اور مختلف سطحوں پر ان اداروں کی صورت میں ایسی چھلنیاں لگانے پر آخر کیوں مصر ہے جن سے اُس کے اپنے ذوق کے نمائندے ہی چھن چھن کر سامنے آئیں۔ جو بالآخر اُس کے نقطۂ نظر کے ہی ترجمان ہوں۔ جمہوریت کی اساس رائے عامہ ہوتی ہے جو نظام جس حسن و خوبی کے ساتھ رائے عامہ کو مسندِ اقتدار پر متمکن کرنے میں کامیاب ہو گا اسی نسبت سے وہ جمہوری ہو گا۔

موجودہ حکومت عام طور پر یہ تاثر دینے کی کوشش کرتی ہے کہ بنیادی جمہوریت کا یہ نظام اس کا ایک شاندار کارنامہ ہے۔ ممکن ہے کہ اُس کے نزدیک یہ ایک کارنامہ ہی ہو لیکن دقتِ نظر سے دیکھا جائے تو یہ اس کی ایک بنیادی ضرورت بھی ہے۔ اقلیت کو اکثریت پر مسلط کرنے کے لیے یہ بالکل ناگزیر ہے کہ ایسے افراد کی ایک کھیپ تیار کی جائے اور ایسے اداروں کا ایک ایسا لمبا چوڑا سلسلہ قائم کیا جائے جو اس کے ہاتھ مضبوط کرے اور اس کے ہر جائز و ناجائز کام میں اس کا حامی اور مددگار ثابت ہو۔ چنانچہ اس نظام سے یہی کام لیا جا رہا ہے۔ جن لوگوں کے

ہاتھ میں اس کی باگ ڈور ہے وہ حکومت کے ہی اعوان و انصار ہیں اس لیے یہ قوم پر کوئی احسان نہیں بلکہ اقتدار کی ایک ناجائز ضرورت پورا کرنے کا ایک ناجائز طریقہ ہے۔

اقلیت کو اکثریت پر مسلط رکھنے کے لیے دوسری ضرورت یہ ہے کہ پریس کا گلا گھونٹ دیا جائے تاکہ رائے عامہ کسی طرح بھی منظم نہ ہو سکے۔ ہمارے اس ملک میں پریس کا جو حشر ہوا ہے اُس کے تصور سے روح کانپ اٹھتی ہے۔ سب سے پہلے تو مختلف قسم کی قانونی جکڑبندیوں سے اس کی آزادی کو سلب کیا گیا۔ اخبارات پر پریس آرڈیننس کی تلوار معلق کی گئی تاکہ جس اخبار کا جو حشر حکومت جس وقت چاہے کر سکے۔

پھر پریس ٹرسٹ کے نام سے ایک بڑا خوشحال ادارہ قائم کیا گیا ہے جس کی براہِ راست نگرانی میں کئی ایک اخبارات شائع ہوتے ہیں۔ ملک کے بہت بڑے سرمایہ دار جن کے حکومت سے مفادات وابستہ ہیں وہ اس ٹرسٹ کے ارکان ہیں اور برسرِ اقتدار طبقے کے نہایت ہی معتمد نمائندے اس کے انتظام و انصرام پر مامور کیے جاتے ہیں۔ ان اخبارات کے وسائل اس قدر زیادہ ہیں کہ کوئی آزاد اخبار ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ ان اخبارات کا ایک ضمنی فائدہ یہ بھی ہے کہ ان کے ذریعہ سے ملک کے پڑھے لکھے طبقے میں سے ایک اچھی خاصی تعداد کو خریدنے میں کامیابی ہوئی ہے۔ یہ دانشور اب عوام کے دکھ درد میں شریک ہونے اور اُن کے مصائب دُور کرنے کے بجائے بھاری بھرکم معاوضوں کے لالچ میں برسرِ اقتدار طبقے کی ثنا خوانی میں منہمک رہتے ہیں۔ ان اخبارات کی حیثیت حکومت کے شعبۂ نشر و اشاعت کی سی بن کر رہ گئی ہے جن میں سوائے حکومت کے موقف اور اُس کے نقطۂ نظر کی وضاحت اور تائید کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ حکومت ریڈیو، ٹیلیویژن اور رابطۂ عوام کے دوسرے وسائل پر پہلے ہی بلا شرکتِ غیرے قابض تھی۔ لے دے کر چند اخبارات ایسے تھے جن سے رائے عامہ کو منظم کرنے میں مدد حاصل کی جا سکتی تھی۔ ان کے بھی حکومت کی تحویل میں چلے جانے کے بعد اب یہ ذریعہ بھی بالکل ختم ہو گیا ہے۔ نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ عوام کو اپنا نقطۂ نگاہ سامنے لانے اور اُس کے حق میں رائے عامہ ہموار کرنے کا کوئی موقع نہیں ملتا۔

پریس کے بارے میں حکومت کی اس پالیسی کا ایک اور تشویشناک پہلو یہ ہے کہ سرکار کی نگرانی میں شائع

ہونے والے اخبارات عوام کے لیے جاذبِ نظر بننے کی غرض سے ایسا مواد شائع کرنے پر مجبور ہیں جس کا بیشتر حصہ یا تو سنسنی خیز واقعات یا ہیجان انگیز موضوعات پر مشتمل ہوتا ہے۔ ان اخبارات پر اگر ایک سرسری سی نگاہ بھی ڈالی جائے تو اس امر کا خود بخود اندازہ ہو جاتا ہے کہ اخلاقی اور روحانی تربیت کے یہ مؤثر ذرائع اب عوام کو کن مشاغل کی طرف مائل کر رہے ہیں۔ ان کے صفحات کا بیشتر حصہ یا تو برسرِ اقتدار طبقے کے مختلف افراد کی جاذبِ نظر تصاویر اور اُن کے بیانات سے مزین ہوتا ہے۔ یا ان میں مختلف ثقافتی اداروں کی کارگزاریاں مع تصاویر درج ہوتی ہیں یا پھر ایسے مسائل سے بحث ہوتی ہے جنہیں چھیڑنے کا مقصد بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ اسلام دشمن عناصر اسلامی روایات کا کھلے بندوں مذاق اڑائیں اور اُن کی دیکھا دیکھی دبے ہوئے عناصر بیباک ہو کر اس ناپاک کام کو سرانجام دیں۔ مغربی تہذیب اور مغربی طرزِ معاشرت جس تیزی کے ساتھ ہمارے ملک میں نفوذ کر رہی ہیں اس میں ان اخبارات کو بہت حد تک عمل دخل حاصل ہے۔

رائے عامہ کو منظم ہونے سے روکنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اجتماع اور تقریر کی آزادی پر مختلف نوعیت کی پابندیاں عائد کی جائیں تاکہ عوام کے رجحانات کوئی مؤثر صورت اختیار کر کے کوئی فیصلہ کن قوت نہ بننے پائیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے متعدد حربے اختیار کیے گئے ہیں جن میں سے بعض انتہائی جابرانہ ہیں۔ ڈیفنس آرڈی ننس جیسا ہنگامی حربہ جسے انتہائی پُر آشوب حالات میں بھی بڑی احتیاط کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے اُسے ہر جگہ بلا دریغ حرکت میں لا کر اختلاف کرنے والوں کی سرکوبی کی جاتی ہے۔ اس حربے کی اصل غرض یہ ہے کہ حالتِ جنگ میں جب کسی قوم کو اپنی زندگی کے لالے پڑے ہوئے ہوں اور وہ پوری دیانتداری کے ساتھ یہ محسوس کرے کہ اگر اس نازک مرحلے میں اُس نے کسی فرد یا گروہ کے خلاف ضابطے کی کارروائی کی تو اس میں تاخیر ہو جائے گی اور اس سے پوری قوم کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچے گا، تو وہ اس آرڈی ننس کے تحت اُس کے خلاف کوئی اقدام کرے۔ اس آرڈی ننس کا تعلق قوم اور ملک کے صرف دفاع سے ہوتا ہے اور اس سے شدید ہنگامی حالات میں بھی بڑی مجبوری کے عالم میں فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ اس حربے کو آج تک کسی مہذب قوم نے کسی مخصوص فرد یا گروہ کے اقتدار کے دفاع کے لیے استعمال نہیں کیا سو دنیا کی ساری

ہوشمند تو بس اس کے استعمال میں بڑی احتیاط سے کام لیتی ہیں تاکہ لوگ اسے کسی اندھے بہرے استبداد پر محمول نہ کریں۔ اگر کسی فرد یا گروہ کو بغیر مقدمہ چلائے اور اُس کا جرم ثابت کیے نظر بند کر دیا جائے تو اس سے لامحالہ عوام کے اندر خوف و ہراس پیدا ہوتا ہے اور انہیں یہ تشویش لاحق ہوتی ہے کہ اُن کے بنیادی انسانی حقوق بھی محفوظ نہیں۔ کوئی ہوشمند حکومت بھی عوام کے اندر اپنے حقوق کے بارے میں عدم تحفظ کا احساس پیدا کرنا نہیں چاہتی۔ چنانچہ وہ اس ڈیفنس آرڈیننس سے اُسی صورت میں کام لیتی ہے جب وہ اپنی قوم کو یہ باور کرا سکے کہ اس نے یہ اقدام شدید مجبوری کے تحت محض ملک کی سالمیت کے لیے کیا ہے۔ اس میں اُس کی کوئی ذاتی غرض، یا ذاتی مفاد یا اپنے گروہ کے تسلط کا جذبہ کار فرما نہ تھا۔ مسند اقتدار سنبھالنے والے دانشمند طبقے عوام پر اس آرڈیننس کے بارے میں یہ تاثر قائم کرنے کا غیر معمولی التزام کرتے ہیں تاکہ لوگوں کے دلوں میں اس کی اہمیت اور دفاعی نقطۂ نظر سے اس کی اشد ضرورت کا احساس موجود رہے۔ اور اگر اس کے تحت کسی فرد کی آزادی سلب ہو جائے تو وہ سمجھیں کہ قومی بقا کے لیے بس ایک شدید مجبوری تھی کہ اس آرڈیننس سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جونہی ہنگامی حالات ختم ہوتے ہیں اُسی وقت یہ آرڈیننس بھی کالعدم ہو جاتا ہے۔ مگر ہمارے اس ملک میں یہ ہنگامی حربہ زندگی کا معمول بن کر رہ گیا ہے جس کی بنا پر عوام کے دلوں میں اس کی قطعاً کوئی اہمیت باقی نہیں رہی۔ یہ حربہ جسے ملک اور قوم کے دفاع کے لیے سخت مجبوری کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے اُسے برسرِ اقتدار طبقے بلا تامل استعمال کرتے رہتے ہیں۔ غالباً ان حضرات نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ملکی دفاع کا مطلب اُن کے اقتدار کا دفاع ہے۔ یعنی جب بھی کوئی شخص یا گروہ ان سے کسی معاملے میں اختلاف کرے یا ان کی کسی حرکتِ شنیعہ پر گرفت کرے تو وہ ان کے نزدیک ملک کی سالمیت کے لیے خطرے کا باعث ہے اس لیے ڈیفنس آرڈیننس کے ذریعہ اُس کی آزادی سلب کر لینی چاہیے۔

حکومت اور ریاست دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ حکومت کے ہاتھ وقت کے تقاضوں اور حالات کے تغیر کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں اور عوام کو اس بات کا حق پہنچتا ہے کہ وہ اس امر کا فیصلہ کریں کہ عنانِ اقتدار کسی گروہ کے ہاتھ میں ہونی چاہیے۔ جو لوگ مسندِ اقتدار پر متمکن ہوں وہ کوئی مافوق الفطرت اور معصوم ہستیاں نہیں ہوتیں کہ ان سے اختلاف کی گنجائش نہ ہو۔ حکومت کے کاموں اور اس کی پالیسیوں سے لوگوں کو اختلاف ہوتا

ہی رہتا ہے اور عوام عنانِ اقتدار ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں منتقل کرنے کے لیے جدوجہد کرتے ہی رہتے ہیں۔ لیکن جمہوری ممالک میں اس قسم کی سرگرمیوں پر نہ تو کبھی مارشل لاز نافذ کیے جاتے ہیں اور نہ ہنگامی قوانین سے فائدہ اٹھا کر لوگوں کو پریشان کیا جاتا ہے۔ اہلِ اقتدار اور عوام دونوں ان چیزوں کو انسان کے پیدائشی اور بنیادی حقوق سمجھتے ہیں اس لیے وہ ہر اُس طرزِ عمل سے گریزاں ہوتے ہیں جس سے ان کا احترام ختم ہوتا ہو۔ یہ ہماری بدنصیبی ہے کہ ہمارے حکمرانوں نے اپنے آپ کو ریاست اور مملکت کے قائم مقام سمجھ رکھا ہے اور جو شخص یا گروہ بھی اُس کے خلاف لب کشائی کرتا ہے وہ اس کے ساتھ اس طرح معاملہ کرنے پر اُتر آتے ہیں جس طرح کہ ملک اور قوم کے دشمنوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ اگر کسی فرد یا گروہ کی کوئی بات یا اُس کا کوئی فعل حکمرانوں کی نظر میں ناپسندیدہ ہے تو اس سے نمٹنے کی معقول صورت یہ ہے کہ اس کے معاملے کو عدالت میں پیش کیا جائے اور پھر وہاں اُس کا جرم ثابت کر کے اُس عدالت سے اُسے سزا دلوائی جائے۔ عدالتیں بھی ملک اور قوم کی خیر خواہ ہیں اور وہ اسی غرض کے لیے قائم کی جاتی ہیں کہ مجرموں کو قرار واقعی سزا دیں۔ اس سیدھے اور منصفانہ طریق کو چھوڑ کر جب اندھے بہرے قانون کے ذریعہ اقتدار سے اختلاف کرنے والوں کو ڈیفنس آرڈیننس کی مدد سے ظلم و ستم کا تختۂ مشق بنایا جاتا ہے تو بالکل فطری طور پر لوگ یہ سمجھنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ دفاع اور ملکی سالمیت کی باتیں تو محض بہانے ہیں حکمران طبقے کی اصل غرض حزبِ اختلاف کو زک پہنچانا اور اُسے خاموش کرنا ہے۔ اور چونکہ برسرِ اقتدار طبقے کا موقف اخلاقی اور قانونی اعتبار سے کمزور ہے اس لیے وہ ہنگامی قوانین سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ اس طرزِ عمل سے جہاں ایک طرف ان قوانین کا وزن کم ہوتا ہے وہاں برسرِ اقتدار طبقے کے بارے میں بھی یہ تاثر عام ہو جاتا ہے کہ جو کچھ کیا جا رہا ہے وہ صریح ناانصافی ہے۔ کیونکہ اگر اُس کی بنیاد حقیقت اور انصاف پر ہوتی تو آخر انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے سے کیوں گریز کیا جاتا۔

اقلیت کی اکثریت پر حکمرانی کے لیے ایک ناگزیر ضرورت یہ بھی ہے کہ حکمران طبقے اور خصوصاً اس کی مرکزی شخصیت کے بارے میں عجیب و غریب پروپیگنڈہ کر کے اُس کی عظمت کا نقش دلوں پر بٹھایا جائے۔ اس غرض کے لیے قومی فلاح کے اصل کاموں سے توجہ ہٹا کر سارا زور صرف نمائشی اور سطحی کاموں پر دیا جاتا ہے۔ ہماری

حکومت نے تعمیر و ترقی کے منصوبوں پر اور ان کی تشہیر پر جس قدر روپیہ صرف کیا اُس کا اگر موازنہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ پروپیگنڈے کا پلڑا ہر لحاظ سے بھاری ہے۔ زرعی اصلاحات کو ایک لافانی کارنامے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے لیکن اس سے مزارعین کو جو حقیقی فائدہ پہنچا ہے وہ سب کے سامنے ہے اور ایک طرف اگر چند زمینداروں سے اُن کی زمینوں کے بعض ٹکڑے لے بھی لیے گئے ہیں تو دوسری طرف سرکاری اور فوجی افسروں اور حکومت کے بعض دوسرے بہی خواہوں کو اتنی وافر تعداد میں نئی جاگیریں عطا کی گئی ہیں کہ ایک دوسرا جاگیرداری نظام معرضِ وجود میں آگیا ہے۔ کروڑوں نہیں اربوں روپے مختلف شہروں میں عظیم الشان عمارات اور نئے دارالحکومت کی تعمیر پر ضائع ہوئے ہیں۔ یہ سارے اخراجات غیر پیدا آوری کاموں بلکہ فضول خرچیوں کی مد میں آتے ہیں۔ ان سے قوم کے کسی معاشی مسئلہ کا حل نہیں ہوتا۔ اگر ان شاہ خرچیوں کی بجائے اس رقم کو کسی منصوبے کے تحت پیدا آوری کاموں پر لگایا جاتا تو ملک سے بیروزگاری دور کرنے میں مدد ملتی۔ لیکن حکومت کو تو ایسے کاموں کی ضرورت ہے جو پروپگنڈے کے اعتبار سے زیادہ قدر و قیمت کے حامل ہوں۔ اب اگر کوئی غیر ملکی پاکستان میں آکر یہاں کی سر بفلک عمارات کو دیکھے تو اس کی آنکھیں خیرہ ہو سکتی ہیں جو غالباً خاموش اور تعمیری کاموں سے ہونا ممکن نہ ہو۔ انڈونیشیا کی معیشت کو ان عمارات نے ہی تباہ کیا ہے۔ ایک غریب اور نادار قوم جس کے لاکھوں نہیں کروڑوں افراد بنیادی ضروریات تک سے محروم ہیں، اس کا کوئی حقیقی بہی خواہ ایسے فضول اور نمائشی کاموں پر دولت ضائع نہیں کر سکتا۔

جہاں تک زبانی وعظ و تلقین کا تعلق ہے شاید ہی کوئی ایسا موقع ہو جس میں برسر اقتدار طبقہ فضول خرچی کی مذمت نہ کرے لیکن خود اپنا حال یہ ہے کہ مسرفانہ تقریبات کا باقاعدہ اہتمام کیا جاتا ہے جن میں اس مفلوک الحال قوم کی کمائی پانی کی طرح بہائی جاتی ہے۔ اس طبقے کی پیروی میں اب چھوٹے چھوٹے سرکاری افسروں نے بھی دربار سجانے اور جشن منانے شروع کر دیئے ہیں۔ ان تقریبات میں جو اخلاق سوز مظاہرے ہوتے ہیں ان سے کوئی فرد بھی ناواقف نہیں۔ پھر ان پر جس طرح بے تحاشا روپیہ خرچ کیا جاتا ہے اگر اُسے صحیح طور پر جمع کرکے اس کا تخمینہ لگایا جائے تو وہ کسی طرح کروڑوں سے کم نہ ہوگا۔

ابھی اکتوبر میں جس انداز سے عشرہ ترقیات منایا گیا وہ اس اسراف کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ معاشی، معاشرتی، اخلاقی اور تعلیمی ترقی کسی ایسی غیر مرئی کیفیت کا نام نہیں کہ اسے محسوس کرانے کے لیے کوئی زبردست مہم درکار ہو۔ جب ملک میں معاشی خوشحالی ہوتی ہے اُسے ہر شخص اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہے اور اُس کے ثمرات سے ہر فرد خود بہرہ مند ہوتا ہے یہی حال اخلاقی اور تعلیمی ترقی کا ہے۔ سورج جب طلوع ہوتا ہے تو زمین خود بخود اس کی روشنی سے منور ہو جاتی ہے اور لوگ اپنی آنکھوں سے اُسے دیکھتے اور قوتِ حس سے اُسے محسوس کرتے ہیں مگر معلوم نہیں کہ ہمارے اس ملک کے عوام کی بصیرت اور بصارت اور اُن کے فہم و تدبر اور قوتِ احساس کے بارے میں ہمارے حکمرانوں نے کیوں بے اعتمادی کا مظاہرہ کیا ہے اور انہوں نے اس نے اس بات کی ضرورت کیوں محسوس کی ہے کہ موجودہ حکومت کے دم قدم سے جو فیض جاری ہوا ہے اُس سے لوگوں کو روشناس کرایا جائے۔ اگر یہ فیض کسی داخلی کیفیت کا نام ہے اور یہ فیض عام ہے تو عوام کو اس سے مطلع کرنا بالکل عبث اور بیکار کوشش ہے۔ عوام لاکھ جاہل اور عاقبت نا اندیش ہی سہی لیکن وہ اتنے کوتاہ اندیش اور اپنے دشمن نہیں ہوتے کہ وہ اپنے فائدے کی چیزوں کو بھی پہچاننے سے قاصر رہیں۔ فلاح و بہبود سے کوئی فرد بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ خصوصاً معاشی فلاح تو ایسی چیز ہے۔ جسے ہر شخص پوری طرح محسوس کرتا ہے۔ اس کا احساس دلوانے کے لیے پورے ملک میں تقریبات کا انتظام بالکل سعی لاحاصل ہے۔ لیکن ہمارے ہاں اس بیکار مقصد کے لیے پوری قوم کو دس دن تک اس میں مصروف رکھا گیا اور مختلف طریقوں سے اُسے یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ گزشتہ دس سال میں فیلڈ مارشل صاحب کی قیادت میں قوم نے حیرت انگیز ترقی کی ہے اور اسے اگر صاحب صدر کی یہ انقلاب انگیز قیادت میسر نہ آتی تو صرف راکھ کا ڈھیر ہوتی جسے عاقبت نا اندیش سیاست دان جس طرف چاہتے اُڑا کر لے جاتے۔ کاش کوئی صاحب بصیرت مال و دولت کے اس ضیاع کا جائزہ لے جو عشرہ ترقیات منانے میں صرف ہوا ہے۔ اور پھر اس بات کا بھی اندازہ لگائے کہ اگر اس دولت کو کسی تعمیری کام میں صرف کیا جاتا تو اس سے کیا مفید نتائج حاصل ہوتے۔

(باقی ص۶۴ پر)